# اقبالؒ ۔ پیمبرِ حرکت و حرارت

مولانا صلاح الدین احمد (مرحوم)

مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کی یاد میں ہم علامہ اقبال مرحوم پر اُن کا یہ معرکتہ الآراء مقالہ بشکریہ محکمہ تعلقات عامہ پنجاب، نیز بشکریہ بزمِ اقبال لاہور "فکر و نظر" کے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں، مرحوم نے یہ مقالہ ۲۱ اپریل ۵۷ء کو یومِ اقبال کی اس مجلس میں پڑھا تھا جو محترم ایس اے رحمان صاحب کی زیرِ صدارت منعقد ہوئی تھی علامہ اقبال مرحوم کے پیغام کو سمجھنے میں یہ مقالہ بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ (مدیر)

اقبالؒ کے ایوانِ شاعری میں جو صدائے بازگشت فضا کو شاید ابد تک لرزاں رکھے گی، وہ اس کے سرودِ خودی کی گونج ہے۔ زمانہ آج بھی اُسے شاعرِ خودی کے نام سے پہچانتا ہے اور آج سے صدیوں بعد بھی اس کے شاعرانہ تصورات میں تصورِ خودی ہی کو اوّلیت کا شرف حاصل رہے گا۔ اسی طرح اس نے جن تصورات کو متشکل کیا ہے ان میں مردِ مومن کا تصور ایک دوامی اور امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ دونوں حقائق مسلّم ہیں اور ان کے ثبات و قیام میں کسی شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن شاید اس بات پر بہت کم غور کیا گیا ہے کہ اس کی شاعری کا وہ کون سا عنصر اور اس کے سخن کی وہ کون سی کیفیت ہے جس نے خود ان تصوراتِ فائقہ کو جنم دیا اور متشکل کیا اور اس کے سراپائے فن میں زندگی کی رُوح پھونکی۔

اقبال کی شاعری کی عمر کم و بیش چالیس برس ہے۔ اس عرصے کے مختلف ادوار میں اس نے شاعری بھی کی، ساحری بھی کی اور پیمبری بھی کی، اور اسی اثنا میں اس کی جوئے سخن بہارستانِ شباب سے گنگناتی ہوئی نکلی اور صحرائے فلسفہ و حکمت کی وسعتوں کو ایک دریائے مواج کی صورت طے کرتی ہوئی بالآخر عرفان و ایقان کے یمِ ناپیدا کنار سے جا ملی اور اسی دوران میں اس کا جوہرِ طبعِ سخنوری

اور شیوا بیانی کے مراحل سے گذر کر وجدان و الہام کی قدسی رفعتوں پر جا چکا۔ لیکن اس سارے عمل ارتقاء میں ایک رشتۂ مشترک اوّل سے لے کر آخر تک برابر قائم رہا اور شاعرِ مشرق کی بیشتر فنی اور الہامی تخلیقات اسی سے مربوط اور پیوستہ رہیں۔ میری ناچیز رائے میں یہ رشتۂ مشترک وہ روحِ سخن تھی جو کلامِ اقبال میں حرکت اور حرارت بن کر ابتدا ہی سے داخل ہوئی اور مرورِ ایام اور فروغِ فکر کے ساتھ ساتھ نشو و نما پاتی ہوئی اس حد تک ترقی کر گئی کہ بالآخر شاعر کے سارے عرصۂ سخن پر محیط ہو گئی۔ حرارت اور حرکت کا یہ عنصر مخلوط، اگر آپ ذرا غور فرمائیں، تو شعرِ اقبال کا اہم ترین اور عظیم ترین عنصر ہے اور اس میں قطعاً کوئی کلام نہیں کہ اقبال کی شاعری کا حسن و امتیاز اور اس کے پیغام کی سطوت و صولت اسی کے جمال سے مستنیر اور اسی کی قوت سے آفاق گیر ہے۔

یہ بات کسی صاحبِ نظر سے مخفی نہیں کہ ہم نے اپنی شاعرانہ روایات عجم سے ورثے میں پائی ہیں اور اگرچہ ہمارے اکابرِ سخن میں سے ہر بلند پایہ شاعر اپنا ایک مخصوص اندازِ فکر اور ایک ممتاز اسلوبِ اظہار رکھتا ہے، لیکن جہاں تک روایات کا تعلق ہے اور اس تعلق اور اس کے تاثرات سے انکار کرنا محالات میں سے ہے، شعرِ عجم کی شگفتگی و شادابی، رعنائی و زیبائی اور سرمستی و دلکشائی کے خزانۂ عامرہ سے ہر صاحبِ فن نے باندازۂ ہمت و بقدرِ شوق حصہ پایا۔ اقبال بھی ان اکابر میں شامل تھے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شعرِ عجم کا وہ سرمایۂ آتشیں، کہ ہزارہا سال کی آتش و آفتاب پرستی کا نتیجہ تھا، تمام و کمال ظلمت کدۂ ہند کے اسی ایک آتش نفس کو منتقل کیا گیا کہ بختِ ملت کی شبِ تیرہ و تار میں اپنے کاروانِ گم شدہ کی رہنمائی کا سامان بہم پہنچائے اور اپنی آتش نوائی سے ان خفتگانِ راہ کو بیدار کر دے جن کی گراں خوابی شورِ قیامت کے سوا اور کسی ہنگامے کی منتظر نہیں تھی۔

لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ شعرِ عجم کا سوز محض ایک انفعالی کیفیت رکھتا تھا، فعالی خصوصیات سے ناآشنا تھا۔ وہ دل کو گداز تو کر سکتا تھا، لیکن ناسازیٔ زمانہ پر برق بن کر گرنا اُسے نہیں آتا تھا۔ وہ سینۂ شاعر کو تو روشن کر سکتا تھا لیکن جادۂ کارواں کو منتیر کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پس اقبال نے مجمرِ عجم سے ایک چنگاری تو ضرور مستعار لی لیکن اسے اپنی ہی خاکسترِ دل میں اس انداز سے فروغ دیا کہ جب وہ شعلہ بن کر چمکی تو اس کے نور سے نہ صرف شاعر کی اپنی روح جگمگا اٹھی بلکہ وہ آفاق بھی پُرانوار ہو گئے جہاں تک اس کی آتش بیانی کا زیر و بم پہنچ سکتا تھا۔ اقبال کی شعلہ نوائی

مشرقی شاعری میں آپ ہی اپنی مثال ہے۔ وہ بیک وقت اس سوز کی بھی حامل ہے جو دل کو گداز بخشتا ہے اس حرارت کی بھی سرمایہ دار ہے جو خود زندگی کا منبع ہے اور اس روشنی کی بھی امین ہے جو حقیقت کا جلوہ دکھاتی اور صداقت کا راستہ صاف کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کا دل خود ایک پارۂ نور ہے کہ ہر لحظہ اس نور الانوار سے کہ زبان قرآن میں "نور السمٰوٰت والارض" ہے، کسب ضیا کرتا اور پھر اس ضیاء کو اس انداز سے منتشر کرتا ہے کہ اس تیرہ خاکدان کی دھند، خنکی اور ظلمت ایک دوسرے کا تعاقب کرتی ہوئی ابد کی پہنائیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔

حرکت حرارت کی ہمزاد ہے اور حکمت جدیدہ کے نزدیک زندگی کی یہ دونوں کیفیتیں بیک وقت ایک دوسرے کی خالق بھی ہیں اور مخلوق بھی، حرارت حرکت کو جنم دیتی ہے اور پھر خود اس سے جنم لیتی ہے۔ زندگی کے ان اوّلین اور بنیادی مظاہر کے اس رشتۂ باہم کا یہ ایک فطری نتیجہ تھا کہ ذہن شاعر میں بھی ان کی نمود اور فروغ ایک ہی تحریک کے تابع ہو، چنانچہ شعر اقبال میں حرارت کی مختلف کیفیتوں کے ساتھ ساتھ ہمیں حرکت کی متنوع صورتیں بھی پہلو بہ پہلو ملتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہماری شاعری کی روایات حرکت کے تصور سے قریب قریب محروم ہیں اور شعر عجم میں فردوسی اور ایک حد تک عرفی کے سوا حرکت کا بہت کم سراغ ملتا ہے، لیکن نوائے عجم کی اس کمی کو سرود عرب پورا کر دیتا ہے اور شاعر کی روح کے تار اکثر اس مضراب کی چوٹ سے جھنجھنا اٹھتے ہیں، جسے غیر مرئی ہونے کے باوجود غیر حقیقی ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ اس کیفیت کا اظہار خود شاعر نے ایک جگہ یوں کیا ہے کہ ؎

مرا ساز اگرچہ ستم رسیدۂ زخمہ ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

اور پھر ایک جگہ اس طرح کہ ؎

عجمی خم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری
نغمہ ہندی ہے تو کیا لے تو حجازی ہے مری

اس میں کوئی کلام نہیں کہ شعر اقبال میں ظاہری طور پر عربی اثرات کا کوئی نمایاں سراغ نہیں ملتا لیکن عربی شاعری کی وہ روح یقیناً اس میں جاری و ساری نظر آتی ہے جو حرکت ہی کا دوسرا نام ہے۔ عرب کا بادیہ نشین شاعر جس کی زندگی صبا رفتار گھوڑوں کی پیٹھ پر، برق رفتار غزالوں کے تعاقب میں بسر ہوتی

تھی، اور جس کا گھر ایک خیمۂ بے نشاں اور جس کا حجلہ ایک شغدف رواں ہوتا تھا، اگر اس کا شعر سرتاسر حرکت نہ ہوتا تو یقیناً وہ زندگی سے محروم رہتا اور شعر کہلانے کا حق دار نہ ٹھہرتا۔ چنانچہ فطری طور پر عرب کی صحرائی شاعری، کہ یہی اس کی حقیقی شاعری ہے، حرکت کی شاعری ہے۔ یہ سچ ہے کہ اقبال اس سے اس انداز میں متاثر نہیں ہوا جس انداز میں وہ عجم کی شاعری اور اس کی روایات سے ہوا، لیکن عربی شاعری کی روح نے اسے بدرجۂ غایت متاثر کیا اور اس کے شعر میں حرکت کے نفوذ کا باعث ہوئی۔

ناقۂ سیار من
آہوئے تاتار من - دولتِ بیدار من
تیز ترک گام زن، منزلِ ما دور نیست
در تپش آفتاب - غوطہ زنی در سراب
ہم بہ شبِ ماہتاب - تند روی چوں شہاب - چشم تو نادیدہ خواب
تیز ترک گام زن - منزلِ ما دور نیست

عرب کو حرارت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے وطن کی زمین اور آسمان دونوں گرم تھے، اسے ٹھنڈے چشموں اور خنک سایوں کی تلاش رہتی تھی۔ اس لئے اس نے اپنی جنت کو سرد اور دوزخ کو گرم بنایا۔ اس کے خلاف، ایران کے وہ خطے جن میں اس کے شعراء کی اکثریت نے فروغ پایا، نہ صرف سرسبز و شاداب بلکہ زمستان میں انتہائی سرد اور یخ بستہ بھی تھے، اس لئے یہاں حرارت دوستی اور آتش و آفتاب پرستی نے رواج پایا اور اپنے اثرات شعر و فن کی روایات پر مرتسم کئے۔

اقبال کے ہاں ہمیں ان دونوں روایات کا ایک لطیف امتزاج ملتا ہے لیکن، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اس نے روایت کی انفعالی کیفیت میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکی اور سخن کو شاعر کے کلبۂ احزاں سے نکال کر بہارستانِ عمل میں آباد کیا۔ چنانچہ جس طرح شعرِ عجم کے سوز و دروں کو شاعرِ مشرق نے فروغِ نو دے کر سرچشمۂ حیاتِ ملی بنا دیا اسی طرح شعرِ عرب کی روایاتی تب و تاب کو اپنے سخن میں سمو کر اس قوت سے ملا دیا جو اس عالمِ ہست و بود میں نیابتِ الٰہی کی سزاوار ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں کردار میں اللہ کی بُرہان

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں
جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

آپ نے دیکھا، آہنگ وہی رزمیۂ عرب کا ہے، لیکن حرکت مقامی کو توسیع آفاقی اور جذبۂ انفرادی کو فروغ اجتماعی دے کر کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا ہے۔

موجودہ مقالے کی ضروریات کے لئے جب میں نے مجموعۂ اقبال پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالی تو میرا خیال تھا کہ میں اس میں سے دس بیس مثالیں اپنے اس نظریئے کی توضیح کے لئے آسانی سے انتخاب کر لوں گا۔ از بسکہ شعر اقبال زندگی کی تفسیر ہے اور زندگی نام ہے ان عناصر دوگانہ کا جنہیں حرکت اور حرارت کہتے ہیں، اس لئے ایک حسین اتفاق سے یہی دو عناصر اس کے شعر کے بنیادی عناصر بھی ہیں۔ اس حقیقت کو اس طرح بھی پیش کر سکتے ہیں کہ از بسکہ زندگی عبارت ہے حرکت و حرارت سے اور یہی دو قوتیں شاعرِ مشرق کے کلام و پیام میں بڑی شدت اور کثرت سے جلوہ آرا ہیں، اس لئے لامحالہ شاعرِ مشرق کا کلام نہ صرف زندگی کی حقیقی تفسیر ہے بلکہ خوابِ زندگی کی سچی تعبیر بھی ہے۔ اس نتیجے تک پہنچنا میرے موضوع میں داخل نہیں تھا، اگرچہ کلام اقبال میں سے حرکت و حرارت کے نظائر تلاش کر کے پیش کرنا یقیناً میرا فرض تھا۔ چنانچہ جب میں نے چند مثالوں کے انتخاب کے لئے کلامِ اقبال کا ایک سرسری سا جائزہ لینا چاہا تو آپ یقین جانئے کہ پہلی ہی کوشش میں میرے ہاتھ شل اور میری نگاہ منجمد ہو کر رہ گئی۔ کلام اقبال کا قریباً ہر شعر اس کے پیامِ حرکت و حرارت کے کسی نہ کسی پہلو کا حامل اور امین ہے۔ اقبال نے اپنی زندگی میں کم و بیش بیس ہزار اشعار کہے ہیں۔ کلامِ اقبال کا مجموعہ ہر جگہ دستیاب ہے۔ اگر کسی کو خدا فرصت اور توفیق دے تو وہ شمار کر کے دیکھ لے، کم از کم پندرہ ہزار اشعار ایسے ضرور نکلیں گے جو اس کے کلام میں حرکت و حرارت کی صدہا کیفیات کے آئینہ دار ہوں گے۔ تعجب ہے کہ کسی صاحبِ ذوق و نظر نے پیامِ اقبال کی اس حقیقت بے مثال پر کوئی مستقل کتاب آج تک نہیں لکھی، حالانکہ بعض پیش پا افتادہ باتوں پر خونِ جگر یا اس کا کوئی ارزاں بدل بڑی فراخ دلی سے صرف کیا گیا ہے۔

اب اس سے قبل کہ میں آپ کے سامنے کلام اقبال میں سے مجبوراً چند مثالیں پیش کر کے آپ سے

رخصت چاہوں اور اپنے اس خواب کو خواب ہی رہنے دوں جو کثرت تعبیر کے باعث پریشان ہو کر رہ گیا ، میں آپ کی توجہ ایک چھوٹے سے نکتے کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اقبال نے اپنے جن تصورات کو مجسم کر کے بار بار اپنے کلام میں پیش کیا ہے ، وہ بھی انہی دو عناصر یعنی حرکت و حرارت کے علیحدہ علیحدہ یا مشترکہ مسمات ہیں اور ان کی مثبت یا منفی کیفیات سے ربط شدید رکھتے ہیں ، مثلاً اقبال کا محبوب پرندہ شاہین ہے جو بیک وقت حرکت اور حرارت کی دوگونہ صفات سے متصف ہے ۔

کیا میں نے اُس خاکداں سے کنارا — جہاں رزق کا نام ہے آب و دانہ
ہوائے بیاباں سے ہوتی ہے کاری — جواں مرد کی ضربتِ غازیانہ
حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں — کہ ہے زندگی باز کی زاہدانہ
جھپٹنا ، پلٹنا ، پلٹ کر جھپٹنا — لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ
یہ پورب ، یہ پچھم ، چکوروں کی دنیا — مرا نیل گوں آسماں بے کرانہ

---

بچۂ شاہیں سے کہتا تھا عقاب سالخورد — اے ترے شہپر پہ آساں رفعتِ چرخِ بریں
ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام — سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر — وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں

شاہین کا تصور اقبال کے ہاں سخت کوشی ، بلند پروازی ، رفعت پسندی کا مجسم تصور ہے اور اسے اُس نے قوم کے نوجوانوں کے سامنے بار بار نمونے کے طور پر پیش کیا ہے ۔ شاہین کے ضمن میں لہو کا بالتکرار ذکر آیا ہے تو لہو کی بات بھی سُن لیجئے ۔ لہو یا خونِ گرم اقبال کا ایک اور مجسم تصور ہے جو اُس کے کلام میں اکثر و بیشتر ہمارے سامنے آتا ہے اور اب ذرا غور کیجئے ، لہو میں گرمی بھی ہے اور روانی بھی ، وہی حرکت و حرارت ، وہی حرارت و حرکت :-

اگر لہو ہے بدن میں تو خوف ہے نہ ہراس
اگر لہو ہے بدن میں تو دل ہے بے وسواس
جسے ملا یہ متاعِ گراں بہا ، اُس کو
نہ سیم و زر سے محبت ہے ، نے غمِ افلاس

لہو سے ذہن نسبت رنگ کے باعث، معاً گل لالہ کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ لالہ اقبال کا محبوب پھول ہے اور اس کثرت سے اُس کے خیابانِ سخن میں کھلا ہے کہ عرصۂ سخن پر لالہ زار کا گمان ہوتا ہے۔ اور لالہ اقبال کے نزدیک حرارتِ زندگی کا زمینی مظہر ہے جس طرح شفق اُس کا آسمانی مظہر:۔

یہ گنبدِ مینائی ، یہ عالم تنہائی
مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی
بھٹکا ہُوا راہی میں ، بھٹکا ہُوا راہی تو
منزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
خالی ہے کلیموں سے یہ کوہ و کمر ورنہ
تو شعلۂ سینائی میں شعلۂ سینائی
تو شاخ سے کیوں پھوٹا ، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا
اک جذبہ پیدائی ، اک لذتِ یکتائی
اُس موج کے ماتم میں روتی ہے بھنور کی آنکھ
دریا سے اُٹھی لیکن ساحل سے نہ ٹکرائی
ہے گرمیٔ آدم سے ہنگامۂ عالم گرم
سورج بھی تماشائی ، تارے بھی تماشائی
اے بادِ بیابانی مجھ کو بھی عنایت ہو
خاموشی و دل سوزی سرمستی و رعنائی

غور کیجئے سات اشعار کے اس رقصاں اور مترنم مجموعے میں حرکت و حرارت کے سات مختلف تصورات ہیں۔ ہوائے صحرا میں گل لالہ کی ، کہ خود شعلۂ سینا کی صورت روئیدہ ہے، اپنی منزل کی تلاش میں سرگردانی اور جذبۂ پیدائی کی تسکین کے لئے سینۂ زمین سے رونمائی ، پھر اس موجِ ناکام کی نارسائی کہ ضعفِ حرکت کے باعث ساحل کے تصادم سے محروم رہی، پھر تماشاگاہِ عالم میں آدم کی گرمیٔ کار، اُس کی نیرنگیاں اور نظر فریبیاں اور آخر میں وہی خالص عربی فضائے شعر۔ بادِ بیابانی کی دل سوزی و سرمستی سے شاعر کا اکتسابِ فیض۔

موجِ دریا اور بادِ صحرا کی جولانیوں سے نگاہ ہٹائیں تو ہوائے شام میں اقبال کا ایک اور تصور مجسم رقصاں نظر آتا ہے ۔ یہ کرمک شب تاب ہے، اور آپ تعجب فرمائیں گے کہ اس حقیر کیڑے پر کلامِ اقبال میں پوری پانچ نظمیں موجود ہیں جو اُس کی تابانی و نور افشانی اور تجسیم نور کی توضیح و تفسیر کرتی ہیں ۔

یک ذرۂ بے مایہ متاعِ نفس اندوخت　　شوق ایں قدرش سوخت کہ پروانگی آموخت
پہنائے شب افروخت

واماندہ شعاعے کہ گرہ خورد و شرر شد　　از سوزِ حیات است کہ کارش ہمہ زر شد
دارائے نظر شد

پروانۂ بے تاب کہ ہر سو تگ و پو کرد　　ہر شمع چناں سوخت کہ خود را ہمہ او کرد
ترکِ من و تو کرد

یا اختر کہ ماہ مبینے بہ کمینے　　نزدیک تر آمد بہ تماشائے زمینے
از چرخ برینے

یا ماہ تنک ضو کہ بہ یک جلوہ تمام است　　ماہے کہ بر و منت خورشید حرام است
آزاد مقام است

اسی طرح آفتاب اور کیفیات آفتاب پر کم و بیش دس نظمیں ان کے ہاں موجود ہیں جن میں سے بعض آریائی تصورات نور و حرارت کی غماز بھی ہیں اور یہ رجحان یہاں تک ترقی کر گیا ہے کہ ان کی غزل بھی اس کے تاثرات سے محفوظ نہیں رہی ۔

میں نے شعرِ اقبال میں تصوراتِ مجسم کا یہ قدرے تفصیلی ذکر دو وجوہ سے کیا ہے ۔ پہلی وجہ تو اس امر کا اظہار ہے کہ اقبال نے اپنے نگار خانۂ سخن میں جتنے تصورات کو مجسم کیا ہے، وہ ادنیٰ ہوں یا اعلیٰ، بلند ہوں یا پست، عظیم ہوں یا حقیر، وہ سب کے سب حرارت یا حرکت یا ان دونوں عناصر کے مشترک مظاہر ہیں ۔ دوسری غرض اس تفصیل سے یہ ہے کہ حرکت و حرارت کے مظاہر میں سے اقبال نے کسی ایک کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا کہ وہ فرومایہ یا حقیر ہے ۔ جہاں کہیں اُسے اپنے پیامِ زندگی کے ابلاغ کا موقع ملا ہے، وہاں اُس نے مہرِ عالم تاب اور کرمک شب تاب میں کوئی تمیز روا نہیں رکھی ، اور

موجۂ دریا اور لالہ صحرا کو یکساں طور پر وسیلۂ اظہار اور ذریعۂ اثبات بنایا ہے۔ مستزاد اس پر یہ کہ حرکت و حرارت کے مظاہر کے سوا اُسے کوئی اور تصور مجسم ہاتھ نہیں لگا جس سے وہ اپنے تصویر محل کی رونق میں اضافہ کر سکتا۔ اس میں شاعر کے عجز کو دخل نہیں، بلکہ یہ محض اس کی صوابدید کا کرشمہ ہے۔ اور اب چند بکھری ہوئی مثالیں۔ اس موقع پر اقبال کے طالب علموں کے ذہن میں اُس کے کلام کے بیسیوں مقامات اُبھریں گے، مگر میں محض چند ایسے اقتباسات پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جو چنداں پیش پا افتادہ نہیں، اس لئے ایک کیفیتِ ندرت لئے ہوئے ہیں۔

بانگِ درا اقبال کا پہلا مجموعہ ہے، اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بجائے خود ایک پیغام رحیل ہے۔ اس میں اقبال کا وہ معرکہ آراء مرثیہ شامل ہے جس کا عنوان ہے والدۂ مرحومہ کی یاد میں۔ مرثیے کی دلدوز اور الم ناک فضا میں بظاہر حرکت و حرارت کی موجودگی کے بہت کم امکانات نظر آتے ہیں، لیکن ذرا دیکھئے:۔

تخم گل کی آنکھ زیرِ خواب بھی بے خواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بے تاب ہے
زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خود نمائی، خود فزائی کے لئے مجبور ہے
سردیٔ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بن کر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ
موت سے گویا بقائے زندگی پاتا ہے یہ
ہے لحد اُس قوتِ آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردنِ گردوں میں جو اپنی کمند
موت تجدید مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں

موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں
پرتوِ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامنِ آفاق سے دھوتی ہے صبح
لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمست نوا کرتی ہے یہ
سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے بادِ صبحدم آباد ہے
خفتگانِ لالہ زار و کوہسار و رود بار!
ہوتے ہیں آخر عروسِ زندگی سے ہم کنار
یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

اس عالم ہست و بود کی مختلف منازل میں سے موت کا مقام ایک ایسا مقام ہے جہاں پہنچ کر انسان بالکل بے بس اور مجبور ہو جاتا ہے اور موت کا پنجہ آہنیں اُس کے ارادوں اور عزائم، اس کی تمناؤں اور اُمیدوں اور اُس کے حوصلہ و وقار کو اپنی گرفت میں لے کر چکنا چور کر دیتا ہے، لیکن دیکھئے اس مقام پر پہنچ کر بھی شاعرِ مشرق اپنی شکست تسلیم نہیں کرتا اور اپنی ماں کے مرقد پر وہ سرنگوں نہیں ہوتا۔ بلکہ اُفقِ خاور کی طرف دیکھتا ہے اور زندگی کی ایک نئی صبح کو خوش آمدید کہتا اور خود زندگی کو نمود و درخشانی کا پیغامِ جاوداں دیتا ہے۔ اکتساب و انتشارِ نور اور تحریک و توسیع کی اس سے خوب تر مثال دنیا کی ادبیاتِ عالیہ میں شاید کہیں مل سکے۔

اور اب ایک اور منظرِ جمیل دیکھئے:۔

طلوعِ اسلام:۔

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
اُفق سے آفتاب اُبھرا، گیا دورِ گراں خوابی!
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اس راز کو سینا و فارابی

مسلمان کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
تڑپ صحن چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں
جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیر سیمابی!
ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہید جستجو کر دے
سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تن نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

اور اب ساقی نامہ کے چند شعر سنا کر آپ سے رخصت ہوتا ہوں۔ یقین ہے کہ آپ اس کے زیر و بم کو حرکت و حرارت کی آمیزشِ نادر سے ہم آہنگ پائیں گے:۔

ہوا خیمہ زن کاروانِ بہار — ارم بن گیا دامن کوہسار
جہاں چھپ گیا پردۂ رنگ میں — لہو کی ہے گردش رگ سنگ میں
وہ جوئے کہستاں اچکتی چلی — اٹکتی، لچکتی، سرکتی چلی

اُچھلتی پھسلتی سنبھلتی ہوئی
بڑے پیچ کھا کر نکلتی ہوئی

رُکے جب تو سِل چیر دیتی ہے یہ
پہاڑوں کے دل چیر دیتی ہے یہ

ذرا دیکھ اے ساقیٔ لالہ فام
سناتی ہے یہ زندگی کا پیام

پلا دے مجھے وہ مئے پردہ سوز
کہ آتی نہیں فصلِ گل روز روز

وہ مے جس سے روشن ضمیرِ حیات
وہ مے جس سے ہے مستیٔ کائنات

وہ مے جس میں ہے سوزِ سازِ ازل
وہ مے جس سے کھلتا ہے رازِ ازل

اُٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

دلِ طورِ سینا و فاراں دو نیم
تجلی کا پھر منتظر ہے کلیم

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا، حمیت میں فرد

عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں خاک کا ڈھیر ہے

شراب کہن پھر پلا ساقیا!
وہی جام گردش میں لا ساقیا

مجھے عشق کے پر لگا کر اُڑا
مری خاک جگنو بنا کر اُڑا!

تڑپنے پھڑکنے کی توفیق دے
دلِ مرتضیٰ، سوزِ صدیق دے

ترے آسمانوں کے تاروں کی خیر
زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر

جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے
مرا عشق، میری نظر بخش دے

مری ناؤ گرداب سے پار کر
یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر

دمادم رواں ہے یمِ زندگی
ہر اک شے سے پیدا رمِ زندگی

اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موجِ دود

فریبِ نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود — کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی — فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پستی و بلند — سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند

اور اب چلتے چلتے ایک لطیفہ سن لیجئے۔ اقبال کو جو دشمنی تھی اور دوستی حرارت سے تھی، اُس کا تقاضا تھا کہ وہ اپنی جنت کو ایک ہنگامہ زار اور جہنم کو ایک سرد خانۂ تاریک کی صورت عطا کریں، چنانچہ وہ اپنی سیرِ فلک کی کہانی یوں بیان کرتے ہیں:-

کیا سناؤں تمہیں ارم کیا ہے — خاتمِ آرزوئے دیدہ و گوش
شاخِ طوبیٰ پہ نغمہ ریز طیور — بے حجابانہ حورِ جلوہ فروش
ساقیانِ جمیل جامِ بدست — پینے والوں میں شورِ نوشانوش
دورِ جنت سے آنکھ نے دیکھا — ایک تاریک خانہ، سرد و خموش
طالعِ قیس و گیسوئے لیلیٰ — اُس کی تاریکیوں سے دوش بدوش
خنک ایسا کہ جس سے شرما کر — کرۂ زمہریر ہو رد پوش
میں نے پوچھی جو کیفیت اس کی — حیرت انگیز تھا جواب سروش
یہ مقامِ خنک جہنم ہے — نار سے نور سے تہی آغوش
شعلے ہوتے ہیں مستعار اُس کے — جن سے لرزاں ہیں مردِ عبرت کوش

اہلِ دنیا یہاں جو آتے ہیں
اپنے انگار ساتھ لاتے ہیں

یہ مقالہ لکھ چکنے کے بعد برادرِ محترم مولانا عبدالمجید سالک سے معلوم ہُوا کہ حضرت علامہ شدید ترین گرمی میں بھی پنکھے کا استعمال نہیں کرتے تھے، لیکن اس کے برعکس موسمِ سرما میں قالین کے اوپر انگیٹھی ہمیشہ اُن کے قریب رہتی تھی اور خود دھسہ اوڑھے، سمٹے سمٹائے بیٹھے رہتے تھے۔ اُن کی حرارت پسندی کا یہ جسمانی پہلو اب تک اوجھل تھا۔ اس کے بعد یکایک یہ نفسیاتی نکتہ بھی سامنے آیا ہے کہ اقبال کے فرزند اکبر کا نام آفتاب اور اُن کی صاحبزادی کا نام منیرہ ہے۔ کسی عظیم فنکار کے شعور و لاشعور میں ایک مرکزی خیال اور مرکزی تصور کی ایسی شدید ہم آہنگی نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ (واللہ اعلم بالصواب)